محمد امجد عابد
لیکچرار، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا شعری سفر

(تمثال تا سُرخ خزاں کی نظمیں)

Dr. Tabassum Kashmiri is known as a critic, researcher and historian. But the most important aspect of his personality is his creativity. He started poetry in 1958 and so far he has published five poetry books. He is considered as an important poet of the form of poetry which was introduced in decade of 60s.
His poetry is his journey of his self which starts and ends at his own self. But this journey is still incomplete. The agony of creativity can be easily felt in his poetry. He speaks to the colors of nature, hears the sounds of birds and discusses as life in its true shape.

تخلیق براہِ راست تخلیق کار کی ذات اور اس کی شخصیت کی پرتیں کھولتی ہے اور اس کی روح کے اعمال نامے اور قلبی واردات کو اپنے حرفوں اور لفظوں میں جذب کیے ہوتی ہے۔ لہٰذا اُسے تلاش کرنے کے لیے تخلیق کار سے مکالمہ ضروری ہے۔ یہ مکالمہ تخلیق کار کو اپنے سامنے بٹھا کر نہیں بلکہ اس کی تخلیق کے روبرو بیٹھ کر ہوتا ہے جہاں اس کے لفظ کلام کرتے ہیں، علامتیں اور تمثالیں خود بخود کھلتی ہیں اور ان میں پوشیدہ کہانیاں رینگتی ہوئی قریب تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ادبی اعتبار سے تبسم کاشمیری کی شخصیت کے ہمہ گیر پہلو ہیں جو تاریخ، تنقید اور تحقیق کے میدان میں کسی تعارف کے محتاج نہیں لیکن اُن کی شخصیت کا ادبی اعتبار سے ایک اہم پہلو اُن کی شاعری بھی ہے جس کا ظہور مذکورہ تین کمالات سے قبل ہوا۔ ساٹھ کی دہائی میں اردو نظم کو جدید ذہنی رجحان و تناظر فراہم کرنے والے شعراء میں تبسم کاشمیری کا نام نمایاں ہے۔اس دور میں شاعری میں نئے تجربات کرنے والے شعراء کو جدید شاعر سمجھا گیا۔ جدید ان معنوں میں کہ ان شاعروں نے شاعری کے مروجہ تصور اور اصولوں سے کسی حد تک انحراف کیا اور حد سے بڑھی ہوئی جمالیات اور عقلیت کے خلاف مزاحم ہوئے۔ انھوں نے شاعری کی بنیاد اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات پر رکھی اور اپنی تخلیق کے لیے ان مقاصد کو بروئے کار لائے جو ان کی نظر میں زندگی کی تمام تر ہنگامہ خیزیوں اور مسرتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مقدس اور بیش قیمت تھے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی شاعری کا آغاز ۱۹۵۸ء کے لگ بھگ ہوا۔ تاہم ان کا پہلا شعری مجموعہ آغازِ شاعری کے تقریباً پندرہ بیس برس بعد ۱۹۷۵ء میں منظر عام پر آیا۔ ''تمثال'' کے نام سے اس شعری مجموعے کا پیش لفظ انیس ناگی نے لکھا جبکہ فلیپ پر سرمد صہبائی کی رائے درج ہے۔ یہ دونوں حضرات بھی جدید شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے معاصرین میں شمار ہوتے ہیں۔ تمثال میں کل چونتیس نظمیں شامل ہیں جن میں عہدِ زوال کے کرب کو شعری تمثالوں میں بیان کیا گیا ہے۔

''تبسّم کاشمیری کی نظموں میں عہدِ حاضر کی تمثال ایک آزردہ خاطر اور مغلوب انسان کے روپ میں نمایاں ہوتی ہے جس کے شیون میں ایک عصر کی کہانی مضمر ہے، اور جو تبسّم کاشمیری اور اس عہد میں بسنے والے ہر حساس شخص کی سوانح عمری بھی ہے''۔ (۱)

تبسّم کاشمیری بنیادی طور پر ایک حساس انسان ہیں۔کسی کو دکھ اور تکلیف میں دیکھ کر افسردہ ہو جانا اُن کے مزاج کا حصہ ہے۔ انھوں نے اپنے بچپن میں ہجرت کے عمل میں جو روح فرسا مناظر دیکھے وہ ان کے ذہن پر مرتسم ہو گئے۔سات برس کی عمر میں اپنے والدین کے ہمراہ امرتسر سے ہجرت کر کے پاکستان پہنچے اور لاہور کے والٹن کیمپ میں پناہ گزین ہوئے۔کیمپ میں مہاجرین کی کثیر تعداد موجود تھی جن میں لوگ اپنے پیاروں کی تلاش میں بے چین و بے قرار تھے۔ ایسے میں اُس دور کے کرب ،دکھ ،دنیا کی بے ثباتی ،مذہبی نفرت اور سیاسی خلفشار نے تبسم کاشمیری کے احساسات ومحسوسات میں ضرور ایک غیر محسوس طوفان برپا کیا ہو گا جس کا اظہار بعد ازاں اُن کی شاعری میں ہوا ۔ہجرت کا کرب اپنی جگہ پر، اپنی جنم بھومی کو چھوڑ کر خانماں خراب کی طرح ایک اجنبی جاء پر قدم رکھنا بجائے خود ایک اعصاب شکن مرحلہ تھا۔ یہ سب معاملات اُن کے لاشعور کا حصہ بن گئے۔ والٹن کیمپ میں چند روز رہنے کے بعد وہ اپنے والدین کے ساتھ راولپنڈی چلے گئے۔ راولپنڈی سے پھر لاہور مراجعت ہوئی۔ ہجرت در ہجرت اُن کا یہ عمل زندگی کے ابتدائی برسوں پر ہی محیط نہیں بلکہ ایک طویل عرصہ گزرنے کے بعد انھوں نے پاکستان سے جاپان ہجرت کی اور تقریباً چوبیس برس تک وہاں مقیم رہے۔ ہجرتوں کے اس سلسلے میں ذات کی شکست و ریخت کے کئی مرحلے ہیں جن سے وہ دو چار ہوئے۔ چنانچہ اُن کی شخصیت کا گداز پن، ایک دھیما انداز، بات کرتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوب جانا، عہدِ رفتہ کے نقوش کو کرید کر اپنے دھیان میں جمانے کی سعی، یہ سب مل کر انھیں ایک ایسی شخصیت کے روپ میں سامنے لاتی ہیں جس پر گہری افسردگی کے سائے چھائے ہوئے ہیں۔ انھیں اپنی تخلیقی زندگی اسی لیے عزیز ہے کہ انھوں نے اپنی ذات پر گزرنے والے المیوں کو تخلیقی سطح پر بے کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ اُن کا پہلا مجموعہ تمثال اس حوالے سے خاص اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں اُن کے عین عالمِ شباب کے محسوسات یکجا ہیں۔ یہ صورت حال اُن کے دوسرے مجموعے نوحے تخت لہور کے (۱۹۸۵ء) میں اپنی بھرپور شدت کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ کاسنی بارش میں دھوپ (۱۹۹۰ء) اور بازگشتوں کے پُل پر (۱۹۹۵ء) کی مجموعی فضا زندگی کی خوب صورتیوں سے لبریز ہے۔ جبکہ سرخ خزاں کی نظمیں (۱۹۹۶ء) ایک بار پھر انھیں یاسیت کے حصار میں لیے ہوئے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ دوبارہ تمثال کے عمل سے گزرے ہیں یا گزر رہے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اُن کا تمام شعری سفر ذات تا ذات ہے تو شاید یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ تمثال کے پیش لفظ میں انیس ناگی نے لکھا ہے:

''اپنے آپ سے آگاہی اور اردگرد کی دنیا کا ہوش تبسم کاشمیری کی نظموں میں ایک شعوری کوشش کے طور پر نمایاں ہوتا ہے، وہ انسانی عوامل میں ہر حقیقت کو اپنی ذات کے حوالے سے دیکھتا ہے۔ کیوں کہ اس کے نزدیک سب سے بڑی حقیقت اس کی اپنی ذات ہے جس کے واسطے سے وہ مظاہر کا مشاہدہ کر رہا ہے۔'' (۲)

اس سلسلے میں انیس ناگی نے ان کی نظم ''فقط ہونے نہ ہونے'' کا ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ جس میں ''ہونے کا احساس'' ایک لرزش کی طرح بدن میں سرسراتا ہے تو اس سرسراہٹ میں ہزاروں خوشبوئیں یلغار کرتی ہیں لیکن اگلے ہی لمحے سرد موسم کی صورت میں حالات کی یورشیں ''نہ ہونے کا احساس'' کا احساس دلاتی ہیں۔ انیس ناگی کا خیال ہے کہ ''نہ ہونے کا احساس'' ہونے کے شدید احساس کا نتیجہ ہے۔ یہ کیفیت تبسم کاشمیری کی نظموں میں ذات کی داخلیت کو ایک وسیع تر ذات میں منتقل کر دیتی ہے...... (۳)

نہ ہونے کا احساس بھی آگہی کی ایک منزل ہے جہاں رائیگانی اور لاحاصل کا احساس دامن گیر ہوتا ہے اور شاعر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر وہ ہے تو پھر کہاں ہے؟

کبھی محسوس کرتا ہوں کہ میں آخر کہاں پر ہوں
ہوا میں یا زمیں پہ یا فضا کی گزرگاہوں میں
کہیں بھی میں نہیں ہوتا
کہاں ہوں میں نہیں کوئی پتہ مجھ کو
مکاں سے لامکاں کے سفر میں گم تھا
ہوا میں یا معلق تھا
نہیں کوئی پتہ مجھ کو (۴)

نظم کی آخری سطریں اس احساس کو جگاتی ہیں کہ ہر نسل لاحاصل کے کرب میں مبتلا ہے۔ شاعر کے آباء بھی یہی سوچتے ہوں گے کہ ان کے ہونے سے انھیں کیا حاصل ہوا؟ شاعر بھی یہی سوچتا ہے اور اس کے بعد کی نسل کی زبان پر بھی یہی سوال ہوگا۔ چنانچہ شاعر یہ بات سوچتا ہے کہ اس کا نہ ہونا، ہونے سے بہتر تھا۔ زمین کی غربتوں، ذلتوں اور نفرتوں کو دیکھ کر آنکھ کے صدمے اٹھانے کا دکھ جھیلنا پڑتا ہے۔ نظم ''کب سے اپنی تلاش'' میں بھی یہی سوال ابھرتا ہے۔ ''میں کہاں ہوں کیوں کر ہوں کس لیے ہوں؟'' نظم کی یہ سطریں دیکھیے:

میں کب سے اپنی تلاش میں ہوں
میں کب سے خود کو تلاش کرتا زمیں کے تلووں کو چاٹ آیا
زمیں کی پوشیدہ سطحوں پہ میں جھانک آیا
میں تار لمحوں کے ساحلوں کی ترائیوں میں لڑھک لڑھک کر
میں دلدلوں کی اتھاہ پکڑ میں جکڑ گیا ہوں
میں حیرتوں کے مہیب جنگل میں گم ہوا ہوں
میں سبز کائی میں کھو گیا ہوں

میں آپ اپنی تلاش کرتا

زمیں کے چہرے پہ ریزہ ریزہ بکھر گیا ہوں (۵)

تبسم کاشمیری اپنی تلاش کے عمل میں کہاں کہاں کا سفر نہیں کرتے۔ یہ دراصل آج کے انسان کی تلاش کا عمل ہے۔ جس کے وجود کی اکائی خطرے میں پڑ چکی ہے۔ وہ زمیں کے چہرے پہ ریزہ ریزہ بکھر گیا ہے۔ زمین کی آخری حدوں تک کہیں اس کا نشان نہیں ملتا۔ وہ شاید تاریک لمحوں کے ساحلوں کی ا ترائیوں میں لڑھک کر دلدلوں کی اتھاہ میں اتر گیا ہے۔ یا پھر حیرتوں کے مہیب جنگلوں میں گم ہوگیا ہے۔ یا پھر سبز کائی میں کھو گیا ہے تلاش کا یہ سفر بے انت مسافتوں کے ذریعے طے نہیں ہوتا۔تبسم کاشمیری اور ان کے عہد کے دیگر شاعروں کا یہ المیہ ہے کہ وہ ایسے دور میں زندہ ہیں جس میں معاشرہ تباہ حال ہے۔جیلانی کامران اس عہد کی منظر نمائی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

’’پہلے ان دنیاؤں اور معاشرے کے مابین محسوسات کی آمدورفت تھی۔ انسان جزیرے کی قید میں نہ تھا اس لیے اکیلا نہ تھا اور نہ موت کی خوفنا کی اس پر حاوی تھی لیکن آج معاشرہ ان تمام رابطہ بندیوں سے محروم ہے جو اسے کسی زمانے میں سا لمیت اور معانی دیتی تھیں...... موت کے یقینی اور بے یقینی حملے جغرافیائی حد بندیوں، صنعتی پروگراموں اور تلاش روزگار کے شور میں ایسے نازل ہوتے ہیں جیسے آسمان سے برق گرتی ہے اور پھر گہرے بادلوں میں چھپ جاتی ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ ہم کون ہیں؟ میں کون ہوں؟ زندگی کے معانی کیا ہیں؟ رات کی پھیلی ہوئی سیاہی کیوں ہے؟ یہ جنگل کس عبادت گاہ کے بغیر ہے؟ لمحے کی داستان کیا ہے؟ راستہ، سفر اور ایک نہ ملنے والی منزل...... کیا یہ زندگی ہے؟ نئی نظم کے مختلف مسائل انھی فقروں سے مرتب ہوتے ہیں‘‘۔ (۶)

اس صورت حال میں تبسم کاشمیری کی نظمیں معاشرے کے رِستے ہوئے ناسُوروں، ایک بے ہیئت زندگی اور بے جہت سفر کی روداد سناتی ہیں۔ ہر طرف شبِ سیاہ کے اندھیرے مسلّط ہیں۔ شبِ غضب نے نسلوں کے بعد نسلوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ رحم مادر سے باہر آئے جو آنکھ کھولی، زمیں پہ دیکھا شبِ غضب تھی۔ بچپن سے نوعمری، نوعمری سے اوجِ جوانی، اوجِ جوانی سے ادھیڑ عمری اور پھر ادھیڑ عمری سے بڑھاپا، عمر کے ڈھلتے سایوں میں شبِ غضب برابر ساتھ ساتھ چلتی رہی ہے۔ نہ امید کا سورج طلوع ہوتا ہے نہ اپنے دن بدلتے ہیں۔ اداس نسلوں کی یہ کہانی سنانے والے اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کے چمکتے ہوئے جگنو لیے ہوئے ہیں اور یہ پوچھتے ہیں کہ آخر یہ سیاہ رات کب ڈھلے گی:

شبِ غضب ہے دراز کتنی ، شبِ غضب ہے دراز کتنی

خموش بیلیں، اداس آنگن، شکستہ گلیاں

کنواریوں کی ملول آنکھیں

دلہنوں کے کنول سے چہرے

اداس بچے، نحیف بوڑھے، نزار مائیں
نزار مائیں کہ جن کی آنکھیں ہوئی ہیں پتھر
یہ پوچھتی ہیں
شبِ غضب ہے دراز کتنی، شب غضب ہے دراز کتنی (۷)

سرمد صہبائی، ''شبِ غضب'' کے اس تاریک سفر میں آ گہی کی روشنی پھوٹتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک:

''تبسم کاشمیری کی منزل اسی ''آ گہی'' کی دریافت ہے کہ کرب اور لاحاصلی کا یہ سفر طبقاتی شعور کی طرف ہے۔''(۸)

یہ طبقاتی شعور ان کی ترقی پسندانہ سوچ کا نتیجہ ہے۔ ایک نئی اور روشن صبح کا خواب ان کے دھیان میں آ کر اپنے خدوخال اور نین نقش بناتا ہے۔ ''آ گہی'' نے اس خواب کو جو تعبیر بخشی ہے وہ آ گ کے شعلوں میں ہواؤں کی نئی روئیدگی کی صورت آواز دیتی ہے۔

نیا موسم بشارت ہے
کنول پانی میں کھلتے ہیں
بہار آئے گی راہوں میں
شگوفے سرخ ہو جائیں گے
منظر خوب دہکے گا

....

اگر موسم بدل جائے ، شگوفے سرخ ہو جائیں
ہمیں آواز دے لینا
کہ ہم دہکے ہوئے منظر کو دیکھیں گے
کثافت اور کسالت کے دنوں کو بھول جائیں گے (۹)

نوحے تخت لہور کے تبسم کاشمیری کی ایک طویل نظم ہے۔ جو اسی نام سے کتابی صورت میں ۱۹۸۵ء میں منظر عام پر آئی۔ فکری اعتبار سے یہ نظم تمثال کی نظموں کی توسیع ہے۔ اس نظم میں شہر کی بربادی کا نوحہ لکھا گیا ہے۔ ایک چیختا چلاتا شہر ہے جس کی نبضیں تھم چکی ہیں۔ بھوکے لوگوں کی داستانِ الم ہے جن کے شکموں میں بھوک کے سورج جلتے ہیں۔ آ گ کے سائے ہر گھر پر مسلط ہیں۔ ہر جسم اسی دہکتی ہوئی آ گ میں جھلس رہا ہے۔ شہر ویرانی کا منظر پیش کر رہا ہے۔ اس کی ساری رونقیں ختم ہو چکی ہیں۔ اس کا سارا سبزہ اور ہریالی خزاں کی نذر ہو چکی ہے۔ اور اس کے در و بام کا

حسن ماند پڑ چکا ہے:

شہر کے رنگ جو سبز تھے پہلے

اب جل کر سب زرد ہوئے ہیں

اب وہ پیلے زرد ہوئے ہیں

شہر کا چہرہ زرد ہوا ہے

شہر کی آنکھیں زرد ہوئی ہیں

شہر کا جسم اب زرد ہوا ہے

شہر کا شہر اب زرد ہوا ہے (۱۰)

لاہور سے تبسم کاشمیری کو ایک خاص تعلق ہے۔ سات سال کی عمر میں وہ لٹے پٹے حالوں اس شہر میں وارد ہوئے۔ بعد میں انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسی شہر میں گزارا۔ اس شہر کی آباد گلیوں، حسین شاموں اور جگمگاتی شبوں میں ہنستے بستے جوانی کے دن گزارے۔ اس شہر نے کچھ اس طرح انھیں اپنی آغوش میں بھرا کہ امرتسر سے ہجرت کا غم انھیں بھلا دیا۔ لیکن اس شہر کی بدلی ہوئی حالت انھیں افسردہ کر دیتی ہے۔ صنعتی انقلاب نے لاہور کی صاف فضا کو آلودہ کر دیا ہے۔ دھوئیں کے دبیز بادلوں نے اس شہر پر مسلط ہو کر اس کے حسین چہرے کو گہنا دیا ہے۔ یہ صورت حال تبسم کاشمیری جیسے حساس شاعر کے دل پر گہری چوٹ لگاتی ہے اور وہ اس کے مسخ چہرے کو دیکھ کر شدید صدمے سے دو چار ہوتے ہیں۔ اسی شدید صدماتی کیفیت کو انھوں نے اس نظم میں قلم بند کیا ہے۔ ان کی یہ نوحہ گری، دل کو مٹھی میں لے کر یوں دباتی ہے کہ جسم میں درد کی ایک تیز لہر دوڑ جاتی ہے۔

کاسنی بارش میں دھوپ تبسم کاشمیری کا تیسرا مجموعہ کلام ہے، جو ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل نظمیں اوسا کا (جاپان) میں قیام کی یادگار ہیں۔ مجموعے کا انتساب بھی، منوسٹی، اوسا کا کے ایک چھوٹے سے گھر کے نام ہے، جہاں یہ نظمیں لکھی گئیں۔ مجموعے کے فلیپ پر ناشر کی طرف سے ایک مختصر تحریر درج ہے جس میں یہ لکھا گیا ہے کہ ''ان نظموں کا مطالعہ جدید اردو شاعری میں نظم اور نثری نظم کے نئے ذائقوں اور نئے لمس سے آشنا کرتا ہے۔'' ان لفظوں میں موضوعات کے نئے افق ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جاپان جانے کے بعد تبسم کاشمیری کو نئے ماحول کی فطری فضا میں قدرت کی نیرنگیوں کو بہت قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع میسر آیا۔ ان کی نظر اور اندازِ نظر میں وسعت پیدا ہوئی۔ جذبے اور احساس کی ایسی شکلیں وجود میں آئیں جو شاعر کو ایک وسیع دنیا میں خواب، حقیقت اور آدرشوں کے ساتھ ایک مسلسل سفر میں مصروف دکھاتی ہیں۔ یہ رنگوں، خوب صورتیوں اور حسن کے نظاروں کے پیچ تلاش اور امکانات کا ایک نا مختتم تخلیقی سفر ہے جس کے بہاؤ میں شاعر یک گونہ سکون اور مسرت محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ اس مجموعے کی مجموعی فضا احساسِ فرحت سے لبریز اور سرخوشی اور تسکین سے ہم آغوش نظر آتی ہے:

جگنوؤں سے بھرے ہوئے ترکشوں
اور لفظوں سے اَٹے ہوئے
بوجھل خیموں کے ساتھ
بڑھتے رہنا
چاند کے پینڈے کی طرف
دھنک کی کلائیوں کی طرف
اور روشنی کے وطن کی طرف
ایک بنسری اور
کچھ مقدس کلمات کے ساتھ
دو پہیوں، ایک کھڑاؤں
ایک قبا
اور ایک فاختہ کے ساتھ ساتھ
آگے بڑھتے رہنا
ایک ادھورے اور بے نام سفر پر
اس گول کُرّے کے
مقناطیسی بدن پر (۱۱)

یہ نظم اور اسی نوع کی دیگر نظمیں ایک غیر میکانکی عمل میں تشکیل پاتی ہیں اور ایک فطری بہاؤ کے تحت ایک نیا شعری منظر نامہ ترتیب دیتی ہیں جہاں انسان اور فطرت ہم کلام ہی نہیں ہوتے ، ہم آمیز ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ الفاظ جگنوؤں کا روپ دھارتے نظر آتے ہیں۔ چاند، ستارے، ہوا، بارش اور نارنجی رنگ باتیں کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ فطرت اپنی تمام تر دل کشی اور رعنائی کے ساتھ ان نظموں میں جلوہ گر نظر آتی ہے اسی طرح نو بہ نو رنگ ،حسن کی سندرتا میں اضافہ کرتے ہیں۔ فطرت نگاری کا یہی رنگ اور اسلوب ایک تسلسل کے ساتھ تبسم کاشمیری کے چوتھے مجموعہ کلام ''بازگشتوں کے پل پر'' میں بھی نظر آتا ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۹۵ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے کا نام بھی اپنی خاص معنویت رکھتا ہے:

''بہت مشکل ہے اکیلے اکیلے بازگشتوں کے پل پر چلنا'' (۱۲)
''تم بازگشتوں کے پل پر کب تک اس کا انتظار کروگے'' (۱۳)
''بازگشتیں ہمارے کانوں سے چمٹی جاتی ہیں'' (۱۴)

''یا کسی بازگشت کا اک پل بنا لیا ہے'' (۱۵)

''بس ذرا شام گزرنے دو
میں بازگشتوں کے پل پر
تمہیں رات بھر پیار کروں گا'' (۱۷)

''جہاں قدیم آوازوں کی بازگشتوں کو
سننے والا بھی کوئی نہیں'' (۱۸)

''وہ بازگشتوں کے پل پر ہنستی ہے'' (۱۹)

''ایک طویل بازگشت بنتا جارہا ہے (۲۰)

''بازگشت'' کا لفظ واپسی اور مراجعت کے لغوی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔تبسم کاشمیری کے یہاں ''یاد'' کے استعارے کے طور پر آیا ہے۔ یہ دراصل واپسی کا عمل ہے۔ میں نے شروع میں کہا تھا کہ تبسم کاشمیری کا تخلیقی سفر ان کی ذات سے شروع ہوتا ہے اور ذات پر ہی آ کر ختم ہوجاتا ہے۔تو یہ ان کی ذات کی طرف مراجعت ہے۔ مراجعت کا یہ عمل کسی ظاہری شکل میں رونما نہیں ہوتا بلکہ ایک غیر مرئی طریقے سے ان کی ذات کے اندر ہی انجام پاتا ہے۔''پل'' جوڑنے اور رابطے کی علامت ہے۔ شاعر اس پل کے ذریعے اپنے ماضی کے ساتھ ایک غیر منقطع سلسلہ استوار رکھتا ہے جس میں عہد آئندہ کے امکانات بھی موجود ہیں۔''بازگشتوں کے پل پر'' میں نمایاں رنگ فطرت نگاری کا ہے۔ اس میں دل کش باغ بھی ہیں، خوب صورت مناظر بھی ہیں، درخت اور ان پر بیٹھے پرندے اور گیت الاپتے پنچھی بھی ملتے ہیں۔ اس مجموعے کی طویل ترین نظم ''میپلز، پشکلاوتی، موئن جوڈیرو'' ایک خوب صورت نظم ہے جس میں تبسم کاشمیری کا فن اپنی انتہاؤں کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس نظم میں فطرت نگاری کے کمالات اپنے عروج پر دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح ''بازگشت'' کی معنویت بھی پورے طور پر آشکار ہوتی ہے۔

وہ خزاں کی ایک دوپہر تھی
ہم لوٹ رہے تھے
میپل کے سرخ پتے دیکھ کر
خلقت کا ہجوم
چہرے ہی چہرے
چہرے، جو پتوں بھرے راستوں پر
لمحہ لمحہ اُگ رہے تھے

اور چہروں کے اوپر میپلوں کے سرخ سائے
پلوں کے نیچے بہتا ہوا دریا
اور دریا کے دونوں طرف
اونچے نیچے پہاڑ
نیچے پہاڑوں کے اس طرف بیلوں والے پرانے چوبی گھر
اور ان اونچے پہاڑوں پر
دریا میں گرتے ہوئے پتوں کے سرخ سائے
اور سایوں کی آوازیں
دھیمی،
مدھم،
پانی کی لہروں میں گھلتی،
ڈوبتی ہوئی،
بے آواز آوازیں
خزاں کی چمکتی ہوئی دوپہر
ہاں وہ پیلی دوپہر
وہ پتوں کے سرخ سائے
دریا میں تیرتے نیلے بجرے
محبت کرنے والے جوڑے
یاد ہیں کیا؟

....

تب تم نے لگایا ایک قہقہہ
میپل کے پتوں جیسا......سرخ قہقہہ
ہنستے ہنستے سرخ ہوگئے تمھارے رخسار
ہوا میں اڑتے تمھارے بال

تب ہنسنے لگی ہر شے
پتے، بے آواز سائے، پہلی دوپہر
اور ہوا میں جمتے بے آواز رنگ
پل سے نیچے
سرد پانی میں پاؤں لٹکا کر
بیٹھنے والی عورت بھی
ہنسنے لگی، بے ساختہ
بالکل بے ساختہ
پانی میں گرتے بے آواز سایوں کی طرح
کیسی دیوانگی تھی ان دنوں میں
تمھیں یاد ہے نا؟(۲۱)

یہ اس طویل نظم کا محض ابتدائیہ ہے جس میں صدیوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔لکڑی کے پرانے مکانوں والی گلی میں، اَن گنت چوبی سیڑھیاں طے کر کے بدھ کے مندر میں صدیوں پرانا منظر جاگ اٹھتا ہے۔ نروان حاصل کرنے کے لیے آنے والوں کی سات صدیوں سے آتی ہوئی آوازیں...... سات صدیاں بول رہی تھیں، سات صدیوں کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں، سات صدیوں کی زبانیں سوکھ رہی تھی۔ ہواؤں میں فاختہ کی کُوک، ندی کا چوبی پُل، ان دیکھے پانیوں کا شور، درختوں کی سائیں سائیں اور شہر کی روشنیوں کا سمندر، سب کچھ نیچے رہ گیا۔اور پھر پندرہ صدیاں پہلے، میں پشکلاوتی کے ایک پہاڑی مندر میں تھا۔‘‘ سدھارتھ کے پھول بننے کا خواب۔ ایک طویل کہانی جس کا انگ انگ نظم میں بولتا اور ایک پوری تہذیب کا سینہ کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے۔ اور پھر پانچ ہزار برس پہلے کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اور موئن جوڈیرو، سفید پھولوں کی دھرتی کا منظر نامہ دھیرے دھیرے ابھرنے لگتا ہے۔

یہ سفر ہے ان حد
زماں سے زماں تک
یہ بہاؤ ہے روز و شب کا
ہم کاغذ کی کشتیاں
بہتی ہیں پل دو پل
ہمارے بادبانوں میں بھری آوازیں

لیے جاتی ہیں، چپ چاپ، بے آواز
اَن دیکھی سمتوں کی طرف
موئن جوڈیرو سے پشکلاوتی تک
اور پشکلاوتی سے
میپلوں کی اس شام تک
پھر اس سے آگے، اور آگے
اگلے زمانوں کی طرف
ان سے بھی اگلے زمانوں کی طرف! (۲۲)

اکتالیس صفحات پر مشتمل یہ نظم اپنے امیجز، اسلوب اور لفظیات کے حوالے سے ایک شاندار نظم ہے اور گہری معنویت اور بھرپور تاثر کی حامل ہے۔تبسم کاشمیری نے ایک پوری تہذیبی تاریخ کو اس نظم میں سمودیا ہے ۔نظم کا موضوع ان کے قیام جاپان کی دین ہے جہاں انھوں نے بڑی گہری نظر سے بدھ ازم کا مطالعہ کیا اور نہایت دانائی، سلیقے اور مہارت سے اس بڑے موضوع کو نظم کے کرافٹ میں بیان کیا ہے۔ جاپان بہت سے لوگ گئے ہوں گے مگر تبسم کاشمیری نے جس طرح جاپان اور اس کی تہذیب و ثقافت کو اپنے باطن کے آئینے میں اتارا ہے، کسی دوسرے سے ممکن نہیں ہوسکا ۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس سورج دھرتی کو ایک منجھے ہوئے تخلیق کار کی آنکھ سے دیکھا اور اس کے خوش رنگ منظروں کو اپنے قلب میں جذب کیا ہے۔ ان کی نظم ''بلاوا'' ایک خوب صورت جاپانی جزیرے ''آواجی'' کے دل کش منظروں کو جس خوب صورتی سے بیان کرتی ہے وہ ایک اعلیٰ درجے کی تخلیقی مہارت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

بلا رہے ہیں آواجی کے جنگل
آواجی کے جگنو، کیڑے اور ساحلی چراغ
وہاں کی رات دوشیزہ کے بدن جیسی
شفاف ہے
اور شام......
باغبان کی بیٹی جیسی نارنجی! (۲۳)

سرخ خزاں کی نظمیں اپنے مزاج کے اعتبار سے تبسم کاشمیری کی دیگر نظموں سے الگ ذائقہ رکھتی ہیں۔ یہ مجموعہ ان کے کلیات ''پرندے، پھول، تالاب'' میں شامل ہے جو ۱۹۹۶ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا۔ سرخ خزاں کی نظموں پر یاسیت کا رنگ غالب ہے۔خوابوں کے ٹوٹنے کا غم ہے، زندگی کی لاحاصلی کا نوحہ ہے۔ منافقتوں

کا شکوہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رنگوں اور بہاروں کی وادیوں سے گزرنے کے بعد وہ ایک لق و دق صحرا میں آ نکلے ہوں جہاں گرم لُو کے تھپیڑے بدن اور احساس کو جھلسائے دے رہے ہوں۔ ان نظموں میں تبسم کاشمیری نسلی تعصب کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں شریک نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ''افریقا افریقا''، آج مرا دل افریقا ہے''، ''افریقا میں موت''' اور ''مولائسس کے خون کی صبح'' ایسی ہی نظمیں ہیں جن میں نسلی تعصّب کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے۔'' مولائسس کے خون کی صبح'' میں امریکہ کے شاعر مولائسس سے یک جہتی کا اظہار کیا گیا ہے جسے نسل پرستوں نے زیر کر دیا۔ اس کی موت رایئگاں نہیں گئی بلکہ اس کی آنکھیں افریقا میں آزادی کا نیا سورج طلوع ہوتے دیکھ رہی ہیں:

مولائسس کی آنکھیں باہر ابل چکی ہیں
لیکن مولائسس کی آنکھیں جاگ رہی ہیں
جاگ رہی ہیں
ایفریقا پہ حُریّت کے سورج کو وہ دیکھ رہی ہیں
ایفریقا میں ایک نئے سورج کی صبح کو دیکھ رہی ہیں
روشن خون کو روشن صبح کو دیکھ رہی ہیں (۲۴)

تبسم کاشمیری کا شعری سفر تقریباً چھپن برس کے طویل عرصے پر محیط ہے۔ اس دوران میں کئی زمانے آئے اور گزر گئے ان کی آنکھوں نے ان زمانوں کے سرد و گرم کا نہایت باریک بینی سے مشاہدہ کیا۔ اور ان مشاہدات کو اپنے اس سفر کا حصہ بنا دیا جو ان کے باطن میں ازل سے جاری ہے اور جس کا کوئی اَنت نہیں۔ اُن کی اس طویل اور لامحدود سفر کی روداد ان نظموں کے دروبست میں محفوظ ہے۔ ان نظموں کے علامتی اور استعاراتی پیرائے سے گزر کر ان کی اتھاہ میں اترنے اور حقیقت تک رسائی کے لیے ''نظر'' کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا نہیں تو ہم ایک بڑے شاعر کے مافیہ تک پہنچنے سے محروم رہ جائیں گے۔ اس مضمون کے اختتام کے لیے میں نے تبسم کاشمیری ہی کی ایک نظم کو منتخب کیا ہے یہ نظم ان کے تمام تر تخلیقی سفر کا عکس بھی ہے اور ان کی شخصیت کی پہچان بھی:

میں نے سیکھا رنگوں سے مل جل کر رہنا
لفظوں سے کچھ باتیں کرنا
حرفوں کے اندر سو جانا
میں نے سیکھا اپنے اندر اندر چلنا
صدیوں تک کچھ سوچتے رہنا
برسوں تک کچھ دیکھتے رہنا

میں نے سیکھا پیڑوں جیسا سایا رکھنا
بادل جیسی ٹھنڈک دینا
بارش جیسا گیت سنانا
سوسن جیسا پھول بنانا (۲۵)

حواشی وحوالہ جات

۱۔ انیس ناگی، پیش لفظ، تمثال، تبسم کاشمیری، لاہور، ارسلان پبلی کیشنز، ۱۹۷۵ء، ص ۱۴
۲۔ ایضاً، ص ۱۰
۳۔ ایضاً، ص ۱۱
۴۔ تبسم کاشمیری، فقط ہونے نہ ہونے سے، تمثال، ص ۴۰
۵۔ تبسم کاشمیری، کب سے اپنی تلاش، ص ۸۶
۶۔ جیلانی کامران، نئی نظم کے تقاضے، لاہور، کتابیات، ۱۹۶۷ء، ص ۹۱۸
۷۔ تبسم کاشمیری، غضب وہ شب تھی...... تمثال، ص ۲۰
۸۔ سرمد صہبائی، فلیپ، تمثال
۹۔ تبسم کاشمیری، اگر موسم بدل جائے، تمثال، ص ۴۳، ۴۴
۱۰۔ تبسم کاشمیری، نوحے تخت لہو کے، کلیات پرندے، پھول، تالاب، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص ۱۷۸
۱۱۔ تبسم کاشمیری، زماں تا زماں، کاسنی بارش میں دھوپ
۱۲۔ تبسم کاشمیری، اکیلے سفر کرنا، باز گشتوں کے پل پر، لاہور، دستاویز مطبوعات، ۱۹۹۵ء، ص ۱۴
۱۳۔ ایضاً، ص ۱۵
۱۴۔ تبسم کاشمیری، خوب صورت مہمان کے لیے نظم، باز گشتوں کے پل پر، ص ۲۶
۱۵۔ تبسم کاشمیری، بچھڑا ہوا تارہ، باز گشتوں کے پل پر، ص ۳۷
۱۶۔ تبسم کاشمیری، بچھڑا ہوا تارہ، باز گشتوں کے پل پر، ص ۴۳
۱۷۔ ایضاً، ص ۴۳
۱۸۔ تبسم کاشمیری، خدیجہ کے لیے، باز گشتوں کے پل پر، ص ۵۴
۱۹۔ تبسم کاشمیری، ایک نظم، باز گشتوں کے پل پر، ص ۸۱
۲۰۔ تبسم کاشمیری، بحر الکاہل کی لڑکیوں کا گیت، باز گشتوں کے پل پر، ص ۹۹
۲۱۔ تبسم کاشمیری، میپلز، پشکلاوتی، موئن جوڈیرو، باز گشتوں کے پل پر، ص ۱۱۱۔۱۱۳

۲۲۔ ایضاً،ص ۱۵۰،۱۵۱

۲۳۔ تبسم کاشمیری، بلاوا، باز گشتوں کے پل پر،ص ۶۰

۲۴۔ تبسم کاشمیری، مولائسس کے خون کی صبح، سرخ خزاں کی نظمیں، پرندے، پھول، تالاب،ص ۵۳۳

۲۵۔ تبسم کاشمیری، میں نے سیکھا، باز گشتوں کے پل پر،ص ۸۷